ترجمہ قرآن کے اسالیب اور مشکلات

محمد سعود عالم قاسمی

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ایک زبان کی بات کو دوسری زبان میں منتقل کرنا۔لسان العرب میں لکھا ہے "یقال قد ترجم کلامہ اذافسرہ بلسان آخر[1]" جب کوئی شخص اپنی بات کسی دوسری زبان میں بیان کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے ترجمہ کیا، اسی سے لفظ ترجمان بنا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس لفظ کی تعریف اس طرح کی ہے۔

الترجمان المعبر عن لغة بلغة[2] ایک زبان سے دوسری زبان میں تعبیر کرنے والے کو ترجمان کہا جاتا ہے۔

رسول پاک ﷺ نے مختلف قوموں اور ملکوں کے حکمرانوں کے نام جو خطوط اور فرامین ارسال فرمائے وہ ترجمان ہی کے ذریعہ تحریر فرمائے اور آپ کے نام ان ممالک اور حکمرانوں سے جو خطوط موصول ہوئے ان کو ترجمان ہی پڑھ کر سُنایا کرتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ کو حضورؐ نے اپنا ترجمان مقرر فرمایا تھا۔ انہوں نے یہودیوں کی زبان سیکھی، وہ حضورؐ اور یہودیوں کے درمیان مراسلاتی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔[3] حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عباس بھی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے تھے اور ان کا لقب ترجمان القرآن تو بہت معروف ہے۔

ترجمہ قرآن کی تاریخ:

قرآن تمام انسانوں اور ساری زبانوں کے حاملین کے لئے ہدایت نامہ

ہے، مگر عہد نبویؐ میں کسی اور زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ کسی سورہ کے ترجمہ کا بھی پتہ نہیں چلتا کیونکہ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، البتہ عہد صحابہؓ سے قرآن کریم کے ترجمہ کا آغاز ہوگیا، غیر عرب ممالک میں اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ترجمہ کی ضرورت پیش آنے لگی، چنانچہ سب سے پہلے حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنے اہل وطن کے لئے سورہ فاتحہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔[۴]

آج دُنیا میں حضرت سلمان فارسی کے ترجمہ کا کہیں سراغ نہیں ملتا، جب حضرت سلمان فارسیؓ نے پہلی صدی ہجری میں قرآن کریم کے ترجمہ کی داغ بیل ڈالی تو ضرور دوسری اور تیسری صدیوں میں بھی قرآن پاک کا جزوی ہی سہی ترجمہ کیا گیا ہوگا مگر اس کا کوئی نمونہ آج کہیں نہیں پایا جاتا، لیکن یہ درست ہے کہ ترجمہ قرآن میں اولیت فارسی زبان کو حاصل ہے۔

قرآن کریم کا باقاعدہ ترجمہ چوتھی صدی ہجری سے ملنے لگتا ہے اور سب سے پہلا ترجمہ جو دستیاب ہے وہ ابن جریر طبری م ۳۱۰ھ کی عربی تفسیر کا فارسی ترجمہ ہے، جسے علماء فارس کی ایک جماعت نے امیر المنصور بن نوح کے لئے کیا تھا۔[۵] اس کے بعد ہر صدی میں تراجم وتفاسیر کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ علامہ جار اللہ زمخشری نے اپنے عہد یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ترجمہ قرآن کی اشاعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

''قرآن یا تو تمام زبانوں میں نازل ہوتا یا کسی ایک زبان میں، تمام زبانوں میں نازل ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ ترجمہ اس کی نیابت کرتا ہے اور طوالت سے کفایت کرتا ہے، اب رہا کہ ایک زبان میں نازل ہوتا تو قوم رسولؐ کی زبان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ موزوں تھی کیونکہ وہ اس سے قریب تھے، جب انہوں نے اسے سمجھا اور ان سے منتقل ہوکر پھیلا تو ترجمہ اس کے بیان اور مفہوم کے قائم مقام ہوا، چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ عجم کے گروہوں

میں ہر گروہ کے یہاں ترجمہ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود کہ انتہائی دور دراز کے علاقوں، شہروں اور مختلف و متفاوت لوگوں کا اس ایک کتاب پر اتفاق ہے۔[۶]

اردو زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ بہت بعد میں شروع ہوا کیونکہ اردو زبان خود ہی ایک نوزائیدہ زبان ہے، نیز مسلم دور حکومت کے اختتام تک اردو نہ تو سرکاری زبان رہی اور نہ ذریعہ تعلیم کی زبان، اس کے نتیجہ میں اردو میں علمی کتابوں کے ترجمے کی روایت دیر سے شروع ہوئی اور فارسی کے مقابلہ میں علمی تراجم کا سرمایہ اردو میں کم ہی منتقل ہوا۔

اردو زبان میں سب سے پہلے قرآن پاک کا ترجمہ کس نے کیا؟ اس سلسلہ میں تاریخ نگار اور اردو کے دقائع نگار الگ الگ باتیں کہتے ہیں۔[۷] بیشتر لوگ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کو خشت اول قرار دیتے ہیں، مگر صحیح بات یہ ہے کہ اردو زبان میں سب سے پہلے شمالی ہند میں مولانا معظم نابھوی نے قرآن کا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ میں لکھا گیا، اگرچہ مکمل نہیں تھا اور وہ بھی دہلی پر نادر شاہ کے حملے کے دوران آتش زنی میں ضائع ہو گیا، اس سے پہلے کسی اردو ترجمہ قرآن کا پتہ نہیں چلتا، اس کے بعد شیخ مراد اللہ سنبھلی نے قرآن کا ترجمہ و تفسیر ''خدائی نعمت'' کے نام سے ۱۱۸۵ھ میں رقم کیا، مگر یہ بھی مکمل نہیں ہو سکا، اس کا پارہ عم کا حصہ سب سے پہلے کلکتہ سے ۱۸۲۰ء کے قریب شائع ہوا تھا، پھر مطبع نول کشور اور دوسرے مطابع سے بھی شائع ہوا۔ شیخ مراد اللہ سنبھلی پورے قرآن کا ترجمہ و تفسیر کرنا چاہتے تھے، سورہ بقرہ اور آخر کے دو پارے مکمل بھی کر لیے تھے کہ ان کے شیخ حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے ان کو روک دیا، اس طرح یہ سلسلہ موقوف ہو گیا،

اس کے بعد شاہ غلام مرتضیٰ جنون الہ آبادی نے ۱۱۹۴ھ میں پارہ عم کا منظوم ترجمہ کیا، جس کا نام تفسیر مرتضوی رکھا جو مطبع طبعی سے ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا،[۸] ان تینوں ترجموں کے بعد ۱۲۰۵ھ میں شاہ عبدالقادر کا مکمل ترجمہ قرآن سامنے آیا اور ان کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بھی سامنے آیا جس کی تاریخ کی تعیین دانش

وروں اور مؤرخوں کے لیے ایک دشوار مرحلہ ہے۔

شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اپنے والد شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ قرآن ''فتح الرحمان'' سے تحریک پائی اور اردو دنیا کو ایک ایسی نعمت سے سرفراز کیا کہ ان کا احسان آج تک تمام طالبان قرآن مانتے ہیں۔

ترجمہ مشکل کام ہے:

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مشکل کام ہے، کیونکہ دو زبانوں کے محاورے، استعمالات، ساخت، مزاج، اسلوب، ترکیب، ہیئت اور طرز ادا الگ ہوتے ہیں، پھر زبانوں کی وسعت اور تنگی بھی مشکلات پیدا کرتی ہے، عموماً مترجم جو کچھ کرتا ہے وہ اصل کتاب کے مفہوم کو خود سمجھتا ہے اور اس نے جتنا کچھ سمجھا ہے ترجمہ کے ذریعہ اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کلام کے دوسرے محاسن کو ترجمہ میں منتقل نہیں کرتا، مترجم پابند ہوتا ہے اور اسے وہ آزادی حاصل نہیں ہوتی ہے جو مصنف کو ہوتی ہے۔ مصنف اپنی آزاد فکر کے لحاظ سے اسلوب الفاظ اور استعارے استعمال کرتا ہے۔ جبکہ مترجم اس لفظی نظام کا پابند ہو کر مصنف کے مدعا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ مشکل اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب اصل زبان کے مقابلہ میں ترجمہ کی زبان، وسعت الفاظ و معانی، لسانی تجربات، مترادفات اور متنوع اظہار بیان کے لحاظ سے کم تر ہو، عربی زبان کے مقابلہ میں اردو نوعمر اور غیر وسیع زبان ہے، وہ نشو ونما کے مرحلہ میں ہے اور ترقی پذیر ہے، مثال کے طور پر صرف شراب کے اوصاف کے لئے عربی میں تقریباً ایک سو الفاظ ہیں، ظاہر ہے کہ اردو میں یہ وسعت نہیں ہے۔ سانپ کے لئے قرآن میں حیان، حیت اور ثعبان تین نام آئے ہیں جبکہ اردو میں صرف ایک لفظ سانپ کفایت کرتا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کہتے ہیں۔

عربی زبان میں ایک ہی لغت کے لئے ایسی خصوصیات ملحوظ ہوتی ہیں جن کا فارسی (اردو بھی اسی خانہ میں ہے) میں فقدان ہے۔ چنانچہ حیوانات کی آوازوں کے

لئے عربی میں الگ الگ نام ہیں، مثلاً اونٹ کی آواز کے لئے رعاء الابل، گائے کی آواز کے لئے خوار البقر، گھوڑے کے ہنہنانے کے لیے صھال الفرس، سانڈھ کی آواز کے لئے نواج التیس، بکری کی آواز کے لئے یعار المعز، گدھے کی آواز کے لئے نھق الحمار، کتے کے بھوکنے کے لیے نباح الکلب، کبوتر کے غٹرغوں کے لیے ھدیر الحمام وغیرہ۔۹

اردو میں ان آوازوں کے لیے الگ الگ نام مقرر نہیں ہیں اس لیے ترجمہ میں عربی زبان کی خصوصیات اور امتیازی اوصاف کو کما حقہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ عربی میں خوف، خشیت اور انذار مختلف حالتوں کے لئے مستعمل ہیں جبکہ ان تینوں الفاظ کا اردو میں ڈر متبادل ہے۔

عربی میں بعض الفاظ اور اصطلاحیں ایسی بھی ہیں کہ وہ بعینہٖ اردو میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ مگر بالکل متضاد معنی کے لئے مثلاً اردو زبان میں رطب و یابس اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، اگر کسی کتاب کی تحقیر مقصود ہو تو کہہ دیجئے اس میں رطب و یابس بھرا ہوا ہے، مگر قرآن میں یہی اصطلاح اچھے معنی میں مستعمل ہے اور جامعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً

"ولا رطب ولا یابس الّا فی کتاب مبین" (الانعام/۵۹)

کوئی خشک و تر ایسا نہیں ہے جو ایک کھلی کتاب میں نہ ہو۔

عربی میں ایک ہی لفظ دو مختلف اور متضاد معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اردو میں یہ اسلوب رائج نہیں ہے، مثلاً، عربی میں "فلوس" روپیہ پیسہ کو کہتے ہیں اور افلاس روپیہ پیسہ ختم ہو جانے کو کہتے ہیں، "قروء" حیض کو بھی کہتے ہیں اور حیض سے پاک ہو جانے کو بھی، شراء کا لفظ خریدنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور بیچنے کے لئے بھی، اس کی مثالیں اردو میں نہیں ملتیں، عربی میں ضمائر کا استعمال اور ان کا مرجع متعین کرنے کا اسلوب خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اردو میں یہ اسلوب رائج نہیں ہے۔

یہی معاملہ اصطلاحات کا بھی ہے، عربی زبان میں الفاظ کی کثرت کے

ساتھ اصطلاحات کی بھی کثرت ہے جبکہ اردو زبان میں الفاظ کی کثرت کے ساتھ اصطلاحات سازی کا مرحلہ جاری ہے۔ بہت سی علمی اصطلاحات جو عربی زبان میں ملتی ہیں ان کا متبادل اردو میں نہیں ہے، مجبوراً مترجم کو وہی اصطلاحیں ترجمہ میں بھی اختیار کرنا پڑتی ہیں مثلاً، فتنہ، فساد، عذاب، آخرت، ثواب، صبر، احسان، شکر، غیب، طاغوت، طلاق، عدت، رضاعت، وغیرہ۔

قرآن الفاظ کے انتخاب میں منفرد مقام رکھتا ہے، ترجمہ تو بعد کی بات ہے اگر خود عربی زبان کا متبادل لفظ قرآن کے کسی لفظ کو ہٹا کر رکھ دیا جائے تو قرآن کی عبارت کا حسن ماند پڑ جائے گا اور اس کے لفظی و معنوی نظام میں خلل پڑ جائے گا بقول علامہ انور شاہ کشمیریؒ "قرآن کریم الفاظ کے انتخاب میں خود اپنا ایک معیار رکھتا ہے اور اس کا معیار نہایت صاف ستھرا، شگفتہ اور اس قدر جامع ہے کہ آپ قرآن کے کسی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لانے سے عاجز ہیں جو قرآن کے منتخب لفظ کی واقعی قائم مقامی کر سکتا ہو، اور یہ اس لئے کہ مخلوق اشیاء کے حقائق پر صحیح اطلاع نہیں رکھتی اور وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ یہاں کونسا لفظ حقیقت کا صحیح ترجمان اور مقام کے واقعی مناسب اور زیبا ہے۔[۱۰]

مترجم کے لئے علمی اصطلاحات اور علمی مباحث اور پھر عربی زبان کی فصاحت و بلاغت اور نفاست دونوں کو قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ مولانا عبدالماجد دریادی لکھتے ہیں۔

"کتاب کسی زبان کی بھی ہو، اگر ادبی اعتبار سے بلند اور معنوی اعتبار سے عظیم ہے تو اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں، ہر صاحب قلم کے لئے کٹھن بلکہ کہنا چاہئے کہ صبر آزما ہے، ہر زبان کی ساخت الگ، ہوتی ہے۔ ترکیبیں جداگانہ، نشست الفاظ کی ایک ہیئت مخصوص، صرف و نحو کے قاعدوں ضابطوں کی ایک وضع خصوصی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر لفظ اپنی زبان میں جو ضمنی مدلولات اور مخفی اشارات و کنایات رکھتا ہے، انہیں زبان ترجمہ کے لفظ میں کیونکر لے آیا جائے۔

مترجم اگر پابندی زبان، ترجمہ کے طور طریقوں، ترکیبوں اور بندشوں، محاورہ وروزمرہ کی رکھے تو یہ اپنانا ہوا ترجمہ کرنا نہ ہوا، زیادہ سے زیادہ اسے ترجمانی کہہ لیجئے اور اگر کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھدینے کا کرلیا اور تکیہ تمام تر لغت اور فرہنگ کی کتابوں پر رکھا تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ و بے کیف بن جائے گی کہ خود اپنی ہی طبیعت بدحظ ہو کر رہے گی اور جی اُس کے پڑھنے پڑھانے کو نہ اٹھے گا۔[۱۱]

مولانا عبدالباری ندوی لکھتے ہیں:

دوسری نازک بحث یہ ہے کہ کلاسیکل کتابوں کے ترجمہ کا اصول کیا ہو؟ اس ملایانہ ترجمہ کا تو نام نہ لو جس میں حضرت مترجم لغت الٹ الٹ کر لفظ کی جگہ لفظ اور حرف کی جگہ حرف رکھتے چلے جاتے ہیں۔

صحیح معنی میں اصولاً ترجمہ نگاری کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کم وبیش حذف، اضافے اور بعض دوسرے جزئی تصرفات کی آزادی کے ساتھ اصل کتاب کے نفس ومرکزی مطالب کی حیثیت سے قائم رکھا جائے اور بس، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مطلب کو ضبط کیے بغیر اور اردو کے محاورے اور گرامر کو ذبح کئے بغیر جہاں تک ہو سکے اصل زبان اور مصنف کے مخصصات اسٹائل کو محفوظ رکھا جائے اور اقل قلیل تصرفات پر قناعت کی جائے۔[۱۲]

قرآن مجید کا ترجمہ مشکل ترین کام ہے:

آجکل اردو زبان میں قرآن مجید کے سینکڑوں ترجمے مل جاتے ہیں، یہ ترجمے ثواب کی نیت سے بھی کیے جاتے ہیں، علمی شہرت وشوق کے جذبہ سے بھی اور دینی خدمت کے بطور بھی، ترجمہ نگاری کا آسان طریقہ اس وقت یہ اختیار کرلیا گیا ہے کہ چند قدیم ترجموں کو سامنے رکھا جائے اور جزوی طور پر تصرفات اور تبدیلی انداز کے ساتھ ایک نیا ترجمہ کردیا جائے اور اس طرح مترجمین قرآن کی فہرست میں جگہ بنائی جائے، مگر درحقیقت عام کتابوں کے ترجمے کے مقابلہ میں

قرآن کریم کا ترجمہ انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، اس میں صرف دو زبانوں کی مہارت ہی درکار نہیں ہوتی بلکہ احتیاط اور تقویٰ وطہارت بھی مطلوب ہوتی ہے، ترجمہ قرآن میں بہت سی ایسی نزاکتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے جن کا خیال عموماً عام کتابوں میں نہیں رکھا جاتا، اگر قرآن کا مترجم عربی واردو زبان پر ماہرانہ قدرت رکھنے کے ساتھ ترجمہ کی دشواریوں اور نزاکتوں سے واقف نہ ہو، اور اپنی فکر، سوچ، ذوق، رائے اور رجحان کو دبا کر قرآن کے الفاظ ومعانی میں مدغم نہ ہو جائے تو ترجمہ کا حق ادا نہیں کرسکتا، کیوں کہ قرآن کے مترجم کو بہر صورت اپنی ذات اور فکر کو بھلا دینا پڑتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی، ''اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہو، اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت کا انکار ایک اچھے مترجم کے لئے ضروری ہے، اپنی بات ہو تو آدمی اُسے سورنگ سے باندھنے کی کوشش کرے، لیکن ترجمہ میں تو آدمی خود بندھ جاتا ہے۔''[۱۳]

ڈاکٹر تحسین فراقی کا کہنا بجا ہے کہ ''ترجمہ اصل میں بہت حد تک نفی ذات کے عمل سے عبارت ہے، یہاں من تو شدم ہی سے کام چلتا ہے تو من شدی سے نہیں، ترجموں میں کامیاب ترین ترجمہ وہی ہے جس میں اصل کی روح کھنچ آئے جس کو پڑھ کر مصنف کے اصل خیالات بلکہ اس کے طرز ادا اور اسلوب تحریر سے بھی کما حقہ واقفیت حاصل ہو جائے، اور اصل متن سے کلیۃ بے نیاز کردے، لیکن ایسے کامیاب ترین ترجمے خال خال ہی ملتے ہیں اس لیے کہ ترجمے کے مطالبات اور مشکلات اس قدر گوناگوں ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا اتنا آسان نہیں۔''[۱۴]

مترجم قرآن کا عجز:

قرآن کریم کے ترجمہ نگاروں کو کم از کم دو طرح کے عجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور غالباً یہ بھی قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ طاقت انسانی کما حقہ اس کے معانی کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

پہلا عجز تو قرآن کریم کے تہہ دار اور لامحدود معانی کو اپنے محدود ذہن وفکر میں سمونے کا ہے، کیونکہ اللہ کے کلام کی تہہ داریوں تک پہونچنا انسان کے بس کی بات نہیں، وہ ایک حد تک ہی اس کے معنی ومُراد سے آگاہ ہوسکتا ہے، یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن کریم نے ان لفظوں میں آشکارا کیا ہے۔

قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثله مددا (الکہف/۴)

کہدو اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہوجائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کافی نہ ہو۔

قرآن کریم اللہ کی قدرت کاملہ کے عجائبات کا آئینہ دار ہے، اس کی جامعیت کا محدود ذہن احاطہ نہیں کرسکتا۔

مترجم کا دوسرا عجز قرآن کریم کی فصیح وبلیغ زبان کے مقابلہ میں ترجمہ کی زبان کی کوتاہی ونارسائی کا اور اس کے اسلوب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا عجز ہے۔ قرآن کی زبان ایسی عظیم الشان ہے کہ خود عرب کے شعراء اور ادیب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر رہے، ظاہر ہے اس کو کما حقہ کسی اور زبان میں بالخصوص اردو زبان میں کیسے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی صرف ایک آیت کو لیجئے۔

وجئتك من سبإ بنبإ یقین (النمل/۲۲) کا ترجمہ کرنا ہو تو پہلے معنوی اعتبار سے نبأ کے لئے اردو زبان میں موزوں لفظ انتخاب کریں گے، نبأ کے معنی خبر کے ہیں لیکن ایسی خبر جو باوقعت اور شاندار ہو، اس مفہوم کا کوئی ایک لفظ اردو میں ملنا مشکل ہے، صفت موصوف بنائیں تو الفاظ میں زیادتی ہوجاتی ہے اس کے باوجود نبأ کی سی وقعت اور شان ترجمہ میں نہیں آپاتی، پھر لفظ یقین بھی ہے اب ''بنبإ یقین'' کا ترجمہ باوقعت یا شاندار خبر تحقیق یا تحقیقی خبر، خبر یقین یا یقینی خبر کرنا ہوگا، لیکن قرآن مجید میں جو

فواصل کا لفظ ''یقین'' سے پہلے کی آیتوں میں غـائبیـن، مُبین سے حاصل ہوتا ہے ترجمہ میں اُسے قائم رکھنا ہوگا، نیز سَبا ونَبا میں جو صنعت بدیع (تجنیس مطرف) ہے اس کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا'' ۱۵

مترجم کے لئے علمی اصطلاحات، نازک مباحث اور پھر قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت اور نفاست بلکہ اس کا اعلیٰ ادبی معیار دونوں کو ترجمہ میں قائم رکھنا مشکل ترین کام ہے۔ پھر اس قرآن کا جس کا اسلوب مخاطب کے حالات اور نفسیات کے لحاظ سے بدلتا ہے۔

قرآن کی ایک اصطلاح طـــاغوت ہے، اور جامع اصطلاح ہے، اس کا ترجمہ اردو میں ایک لفظ میں کرنا آسان نہیں، اسی لئے عام طور پر مترجمین طاغوت کا ترجمہ طاغوت ہی کرتے ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے تین مقامات پر تین مختلف ترجمے کیے ہیں۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۲۵۶ میں فـمـن یـکفر بالطاغوت کا ترجمہ کیا ہے ''اب جو کوئی نہ مانے گمراہ کرنے والوں کو اور آیت نمبر ۲۵۷ میں والـذیـن کفروا اولیاء هم الطاغوت کا ترجمہ کیا ہے ''جو لوگ کافر ہوئے ان کے رفیق ہیں شیطان، سورہ النحل کی آیت نمبر ۳۶ میں ان اعبـدوا اللـــه واجتنبـو الـطـاغوت کا ترجمہ کیا ہے۔ بندگی کرو اللہ کی اور بچو ہڑدنگے سے''۔ ان مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرتے وقت کس عجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی لئے تمام مترجمین نے اپنی نارسائی اور عجز کا احساس کیا ہے اور اس راہ کی نزاکتوں اور دقتوں سے آگاہ کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

غالب اور اقبال کے کلام کے انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں۔ اور سعدی کی گلستان اور مولانا رومی کی مثنوی کے ترجمے انگریزی اور اردو میں موجود ہیں، بڑی قابلیت اور بڑے اہتمام وکاوش سے کیے ہوئے، لیکن ان سب مثالوں میں اصل اور اس کے ترجمہ میں ادبی وذوقی حیثیت سے کوئی مناسبت ہی نہ رہی تو جب یہ حال

انسانوں ہی کی لکھی ہوئی ہر اونچی معیاری کتاب کا ہوا تو اس کتاب کے باب میں کیا کہیے جو دنیا کی ہر عظیم کتاب سے عظیم تر اور ہر بلند نوشتہ سے بلند تر ہے۔ جس کی عظمتوں، رفعتوں، نزاکتوں، لطافتوں، علامتوں تک پورا بار پانا کیا لفظی اور کیا معنوی ہر اعتبار سے حدود بشری سے باہر ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے عالموں، فاضلوں دانشوروں ادیبوں حکیموں عالموں عارفوں کے بھی بس کی بات نہیں کہ دنیا کی اس ایک ہی کتاب الکتاب کو کما حقہ اپنی زبان میں منتقل کر کے دکھا سکیں، کسی نہ کسی منزل پر پہونچ کر سب ہی اپنے کو اعتراف عجز پر مجبور پاتے ہیں۔ کہاں کلام خدائے قدوس و نامحدود اور کہاں فہم واستعداد بندہ محدود، دونوں میں اتنی نسبت بھی تو نہیں جتنی آفتاب کو ذرہ سے، سمندر کو قطرہ سے ہوتی ہے۔ شارحین مترجمین مفسرین اگر کہیں نہ کہیں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ نہ جائیں تو کیا کریں۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیسا کریں ۱۶

تفسیر فی ظلال القرآن کے مترجم مولانا سید حامد علی لکھتے ہیں:

''ایک زبان سے دوسری زبان میں اس طرح ترجمہ کرنا کہ زور کلام بھی منتقل ہو سخت دشوار کام ہے، اور جبکہ عربی جیسی قدیم اور عظیم زبان سے اردو جیسی جدید اور تنگ دامن زبان میں ترجمہ کرنا ہو اور معاملہ کلام الٰہی کا ہو، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسان خدا کے سامنے خود کو حقیر اور بے بس پاتا ہے اسی طرح کلام خداوندی کے مقابلہ میں اسے اپنے عجز کا احساس ہوتا ہے، قرآنی آیات اتنی جامع، اتنی وسیع المعنی، اور زور بیان سے اس قدر بھرپور ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کے ترجمہ یا ترجمانی کا حق ادا نہیں کر سکتا، آیات کی مفصل تفسیر تو کی جا سکتی ہے اگرچہ ان کے معانی کا احاطہ پھر بھی نہیں کیا جا سکتا، مگر مختصر الفاظ میں قرآنی آیات کا صحیح، جامع، تمام پہلوؤں پر حاوی اور قرآنی انداز بیان کی طرح موثر ترجمہ ناممکن ہے، قرآ مجید کے ترجمہ میں بس ایک

حد تک ہی کامیابی ہوسکتی ہے"۔ ١٧

الفاظ کی وسعت اور ترجمہ کی دقت:

قرآن کریم کے ترجمہ میں مشکلات اس کے مفہوم ومعانی میں وسعت وکثرت کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے، قرآن کے بعض الفاظ ذی وجوہ ہیں۔ یعنی مختلف معانی کے متحمل ہیں، قرآن کے بعض الفاظ ایک جگہ جس معنی میں استعمال ہوئے ہیں وہی دوسری جگہ دوسرے معانی کے لئے استعمال ہوئے ہیں مترجم کو موقع ومحل اور نظم کلام کی رعایت کے ساتھ ترجمہ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح بعض آیات کی تفسیر میں بھی مفسروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، اس اختلاف کا اثر ترجمہ میں بھی واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً سورہ طٰہٰ میں ہے کہ سامری نے جب بچھڑا بنا کر اس کو پوجنے کی دعوت دی اور قوم بنی اسرائیل اس کو پوجنے لگ گئی تو حضرت موسیٰ نے سامری سے جواب طلب کیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ قرآن نے اس کا جواب نقل کرتے ہوئے کہا ہے۔

فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها كذلك سولت لی نفسی (طٰہٰ/۹۶)

اس آیت کا ترجمہ شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند کے یہاں اس طرح ہے "پھر بھری میں نے ایک مٹھی پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے پھر میں نے وہی ڈالدی" ١٨

مولانا مودودی نے ترجمہ اس طرح کیا ہے:

میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور اس کو ڈالدیا میرے نفس نے مجھ کو ایسا ہی سمجھایا۔ ١٩

مولانا امین احسن اصلاحی نے ترجمہ اس طرح کیا ہے:

میں نے فرستادہ کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈالدی

اور اس طرح میرے نفس نے سمجھایا۔[۲۰]

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان سب سے مختلف ترجمہ اس طرح کیا ہے:

اللہ کے رسول کی پیروی میں نے بھی کچھ حصہ لیا تھا پھر چھوڑ دیا کیا کہوں میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سمجھائی۔[۲۱]

پہلے تینوں ترجمے اس تفسیر پر مبنی ہیں کہ فرشتہ جس گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا اس کے پاؤں کے نیچے کی مٹی میں نمو پیدا ہو جاتی تھی، سامری نے اُسے اٹھالیا اور بچھڑے میں ڈالدیا۔ جبکہ مولانا آزاد کا ترجمہ اس تفسیر کے پیش نظر ہے کہ سامری پہلے تو حضرت موسیٰ کا پیروکار بنا پھر اُسے چھوڑ دیا۔ پہلی تفسیر عام طور پر مفسرین نے کی ہے دوسری تفسیر ابو مسلم اصفہانی نے کی ہے جسے امام رازی نے نقل کیا ہے اور اسی کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا ہے۔

مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا چاہئے:

مترجم کو دونوں زبانوں پر اس حد تک قدرت ہونی چاہئے کہ وہ ان کے قواعد، اصول ترکیب، اصطلاحات، حقیقت و مجاز، محاورات اسالیب، استعاروں، لفظ و معانی کی نزاکتوں اور مواقع استعمال سے بخوبی واقف ہو۔ اگر کسی ایک زبان پر اس کی قدرت کم ہوگی تو اس کا اثر ترجمہ قرآن پر ضرور پڑے گا۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا تھا کہ

''میرا خیال ضرور ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے زیادہ تجربہ چاہئے کیونکہ نسبت سمجھنے کے سمجھانا مشکل ہے۔[۲۲]

یہ بات عام ترجموں کے متعلق تو درست ہو سکتی ہے جہاں تک قرآن کے ترجمہ کا تعلق ہے تو اس میں طرز ادا سے زیادہ ترجمہ کی صحت اور استنادیت اہمیت رکھتی ہے اس لئے دونوں زبانوں پر یکساں یا کم از کم اصل کی زبان پر زیادہ دسترس کی ضرورت ہے۔

چنانچہ اکمل الدین احسان اوغلو ترجمہ قرآن میں موضوع سے واقفیت، روح

قرآن کی حفاظت کے ساتھ دونوں زبانوں میں یکساں مہارت کو مترجم کی اولین ذمہ داری قرار دیتے ہیں ان کے بقول۔

''بہترین ترجمہ وہ ہے جس میں نصوص قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے جس قدر ممکن ہو سکے اس کی اصل روح کو باقی رکھا جائے گو یہ بہت مشکل ذمہ داری ہے، جس سے آسانی کے ساتھ عہدہ برا نہیں ہوا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کوچہ میں قدم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں میں یکساں کمال و مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کو بولنے والی قوموں کے امتیازات و خصوصیات سے بھی واقف ہو، اس کے علاوہ ترجمہ کا تقاضا ہے کہ مترجم موضوع سے بھی مکمل واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہو، اور اس کی فن نزاکتوں کا بھی اس ادراک ہو۔ ۲۳

قرآن کی جگہ ترجمہ نہیں لے سکتا:

تراجم کی حقیقت اصل کے سفیر اور نمائندہ کی ہوتی ہے، ادبیات کی دنیا میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ترجمہ اصل سے زیادہ وقیع، مفید اور اہمیت کا حامل ثابت ہوا ہے، ترجمہ نے اصل کے تن مردہ میں جان ڈال کر اُسے زندہ اور تابندہ کر دیا ہے، اس کی معروف مثال عبداللہ ابن مقفع کی ''کلیلہ ودمنہ'' ہے جو عربی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، آج کم ہی لوگ اس کی اصل کتاب اور اس کے مصنف سے واقف ہیں، اگر واقف ہیں بھی تو اس کی حیثیت محض ایک علمی نکتہ کی ہے، جبکہ اس کتاب کے عربی ترجمہ نے اصل کی ضرورت کا احساس ہی بھلا دیا ہے۔

ترجمہ قرآن کا معاملہ اس سے بہت حد تک مختلف ہے، کوئی بھی ترجمہ خواہ کسی بھی زبان میں ہو اور کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو وہ نہ تو اصل کے درجہ تک پہونچ سکتا ہے نہ اس کا متبادل ہو سکتا ہے اور نہ کوتاہیوں سے پاک ہو سکتا ہے، ان ساری کوششوں اور خوبیوں کے باوجود مترجم یہی کہہ سکتا ہے۔

ع میرے الفاظ فقط عجز بیان کا اظہار

شیخ صالح بن عبدالعزیز آل شیخ وزیر اسلامی امور سعودیہ عربیہ کے بقول ''یہ

ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا کوئی بھی ترجمہ خواہ کیسی ہی دقت نظر سے انجام پایا ہو ان عظیم معانی کو کما حقہ ادا کرنے سے بہر حال قاصر رہے گا، جو اس معجزانہ متن کے عربی مدلولات ہیں، نیز یہ کہ ترجمہ میں مطالب کو پیش کیا جاتا ہے وہ دراصل مترجم کی قرآن فہمی کا ماحصل ہوا کرتے ہیں چنانچہ ہر انسانی کوششوں کی طرح ترجمہ قرآن میں بھی غلطی کوتاہی اور نقص کا امکان باقی رہتا ہے۔'' ۲۴

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے ترجمہ کو قرآن کے متبادل کی حیثیت سے احکام شرعیہ کے ماخذ و مستدل کے طور پر قبول کرنے کی نفی کی ہے۔ جس طرح قرآن کی تلاوت عبادت اور کار ثواب ہے اسی طرح صرف ترجمہ کا پڑھنا عبادت قرار نہیں پائے گا۔

نماز میں قرآن کی آیتوں یا سورتوں کی قرأت فرض ہے، بغیر قرأت کے نماز ادا نہیں ہوگی، قرآن کریم کو بغیر طہارت کے چھونا فقہاء کے یہاں درست نہیں اور فقہاءِ احناف کے یہاں تو بغیر وضو کے بھی چھونا درست نہیں، یہ مقام ترجمہ کو حاصل نہیں ہوگا اور اس کو چھونے کے لئے طہارت یا وضو کی شرط نہیں ہوگی البتہ مستحسن ہوگا۔ شرعی احکام و مسائل کے استنباط کی بنیاد ترجمہ پر نہیں رکھی جا سکے گی۔ مگر چونکہ ترجمہ قرآن کو بھی ایک طرح کا تقدس حاصل ہوتا ہے کہ وہ بالآخر کلام الٰہی کا مفہوم ہی تو ہے، اس لیے فقہاء امت اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ترجمہ کو قرآن سے الگ شائع کرنے کے بجائے قرآنی آیات کے ساتھ ہی شائع کیا جائے تاکہ اس کی حرمت پامال نہ ہو۔ اور معنوی تحریف کی بھی گنجائش باقی نہ رہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں۔

'' کلام الٰہی کے ترجمہ میں یہ لازم ہے کہ کتاب الٰہی کا نظم (یعنی اصل عبارت) باقی رہے تاکہ اگر مترجم سے بعض جگہوں پر لغزش ہو جائے تو دوسرا شخص حدیث رسول '' فرب مبلغ اوعیٰ له من سامع '' کے مطابق اس غلطی کا تدارک کر دے'' ۲۵

ترجمہ قرآن کا اثر اردو زبان پر:

یہ بات بہت اہم ہے کہ صرف ابلاغ و ترسیل اور تسہیل ہی مترجم کے پیش

نظر نہ رہے بلکہ وہ قرآن کے محاسن کا جہاں تک ممکن ہو سکے اتباع کرنے کی کوشش کرے، یہ اگرچہ بہت مشکل کام ہے اور فن ترجمہ پر عبور کا متقاضی ہے مگر اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک تو وہی جس کا تذکرہ شاہ ولی اللہ نے کیا۔ اور دوسرا یہ کہ اردو زبان بھی گرانقدر ہو جائے گی۔ چنانچہ اردو کے ممتاز نقاد محمد حسن عسکری زور دیکر کہتے ہیں کہ۔

''اردو والے ترجمہ میں بس یہی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو پڑھتے ہوئے ایسا لگے جیسے کتاب اردو ہی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہونچتا ہے، اس میں شک نہیں کہ اس سے ترجمہ کا کام بہت پکا ہو جاتا ہے، لیکن ہماری زبان وہیں کی وہیں رہتی ہے جہاں تھی''[۲۶]

قرآن کریم کے مختلف الاسالیب تراجم نے اردو زبان کے لسانی اور ثقافتی سرمایہ کو وسعت اور ترقی عطا کی ہے۔ قرآن کی اثر انگیزی اور بلاغت نے اردو زبان کی تہذیبی سطح کو بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے اور ترجمہ سے یہ فائدہ زبان کو حاصل ہوتا ہے وحید الدین سلیم کے بقول:

''الفاظ معلومات پر دلالت کرتے ہیں، اور الفاظ کی بہتات معلوم کی بہتات پر دلالت کرتی ہے، پس جس قوم کی زبان میں الفاظ کی تعداد کثیر ہے، اس کی معلومات کا دائرہ بھی بمقابلہ اس قوم کے جس کی زبان میں الفاظ کی قلت ہے نہایت وسیع ہوگا، اس بناء پر پہلی قوم بمقابلہ دوسری قوم کے لازمی طور پر زیادہ مہذب ہوگی''[۲۷]

ترجمہ قرآن کے اسالیب اور شاہ ولی اللہ:

اردو زبان میں بنیادی طور پر تین اقسام کے ترجمے معروف ہیں۔

(۱) علمی ترجمہ (۲) ادبی ترجمہ (۳) صحافتی ترجمہ

قرآن کریم علمی کتاب ہونے کے ساتھ اپنا منفرد ادبی اسلوب بھی رکھتا ہے اس لئے مترجم علمی اور ادبی دونوں اقسام ترجمہ کے اصول و منہاج کو پیش نظر رکھ کر کام چلا سکتا ہے۔ علمی ترجمہ کا تقاضا لفظی ترجمہ ہے اور ادبی ترجمہ کا تقاضا بامحاورہ ترجمہ

ہے، جہاں تک صحافتی ترجمہ کا تعلق ہے تو وہ ترجمہ قرآن کے مقاصد سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ قرآن کی زبان صحافتی نہیں بلکہ علمی اور دعوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کے ترجمہ کے فن پر اپنے مختصر رسالہ المقدمہ فی قوانین الترجمہ میں روشنی ڈالی ہے، ان کا یہ رسالہ ان کے فارسی ترجمہ قرآن فتح الرحمان اور اس کے مقدمہ کے علاوہ ہے جو ہنوز مخطوطہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ٹونک کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے چار طرح کے اسالیب ترجمہ کا تذکرہ المقدمہ فی قوانین الترجمۃ میں کیا ہے۔

اول:- لفظی ترجمہ جس میں ہر لفظ کا الگ الگ ترجمہ کیا جاتا ہے۔

دوم:- پورے کلام میں غور وفکر کر کے ترتیب کے ساتھ عبارت کو ذہن نشین کر کے اپنے انداز سے موزوں اور مناسب الفاظ میں ان کو ادا کرنا، اس ترجمہ کو بیان حاصل المعنی کہا ہے۔

شاہ صاحب نے پہلے ترجمہ کا نقص یہ بتایا ہے کہ لفظی ترجمہ میں اکثر وبیشتر ترجمہ کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے کیونکہ اصل مضمون میں ایسی ترکیب ہوتی ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کے لغت میں اس ترکیب کا ترجمہ صحیح طور پر ناممکن ہوتا ہے اور کم از کم کلام میں رکاکت، پیچیدگی اور اس قسم کے چھوٹے چھوٹے مفاسد کا ارتکاب لازم ہو جاتا ہے۔

دوسرے ترجمہ کی کمزوری شاہ صاحب نے یہ بتائی ہے کہ اکثر وبیشتر یہ ہوتا ہے کہ کلام میں دو مستقل وجوہ کی گنجائش ہے اور مترجم اس درجہ ماہر اور حاذق نہیں ہے کہ ان دونوں وجوہ میں سے متکلم کی مراد کو پا سکے، نتیجہ یہ ہوگا کہ مترجم متکلم کی مُراد کے خلاف ترجمہ کر دے گا، اور سچ پوچھو تو کتب سابقہ میں اسی سبب سے تحریف در آئی ہے۔

ترجمہ کا تیسرا طریقہ بعض لوگوں نے یہ نکالا ہے کہ دونوں ترجموں کو ملا دیا جائے اور ایک کا نقص دوسرے سے پورا کیا جائے اس طرح کہ اگر تحت اللفظ

ترجمہ سے پیچیدگی پیدا ہو تو مفہوم و مراد کے بیان کے ذریعہ اس کا تدارک کیا جائے اور اگر جملہ اور عبارت میں موجود دو وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کو یا متشابہ کی کسی خاص توجیہ کو اختیار کیا جائے تو اس کا علاج تحت اللفظ ترجمہ سے کر دیا جائے، اس اسلوب ترجمہ کو بھی شاہ صاحب نے معیوب اور ذوق سلیم کے خلاف قرار دیا ہے جو مبتدی کے لیے باعث تشویش اور منتہی کے لئے بے کار ہے۔ گویا تینوں اسالیب ترجمہ شاہ صاحب کے نزدیک عیب سے خالی نہیں۔

شاہ صاحب نے ایک چوتھے اسلوب ترجمہ کی نشاندہی کی ہے جسے انہوں نے فتح الرحمان میں اپنایا ہے ان کے بقول۔

''میں نے ایک ہاتھ میں تو ترجمہ لفظی کو لیا اور ساتھ ہی اس کے مفاسد کو بھی پیش نظر رکھا اور اس سلسلہ میں مختلف طریقہائے تصرف کو زیر نظر لایا اور حاصل معنی کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور فہم مُراد کے مشکل موقعوں اور بسہولت ان سے رستگاری کے طریقوں کو منضبط کیا اور یہ سب کچھ پیش نظر رکھنے کے بعد ترجمہ کی داغ بیل اس طرح ڈالی کہ اول لفظی ترجمہ اس طرح کیا کہ نظم قرآنی کے ساتھ پوری مطابقت رہے اور ساتھ ہی لحاظ رکھا کہ افعال کے صلات کا جو اختلاف ہے اس کو اپنے فہم سے درست کیا جائے۔ اور جس مقام پر لفظی ترجمہ میں پیچیدگی راہ پا گئی یا عربی زبان میں ایسی ترکیب واقع ہوئی ہے کہ اس کی نظیر فارسی زبان میں نہیں پائی جاتی تو ان مواقع میں عربی زبان ہی سے ایسے مرادف الفاظ و کلمات کے ذریعہ ترجمہ کر دیا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکیں'' ۲۸

شاہ صاحب نے جو چار طریقے بیان فرمائے ان میں سے آخری اسلوب کو بعد کے مترجمین نے عام طور پر ایک علمی اور فنی نکتہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی، البتہ پہلے دو اسالیب یعنی لفظی ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کو قابل عمل سمجھا۔ یہاں تک کہ ان کے دونوں صاحب زادگان نے بھی انہی دو اسالیب ترجمہ کو اختیار کیا۔

شاہ صاحب کے بیان کردہ اسالیب ترجمہ میں پہلا اسلوب ان کے صاحب زادہ شاہ رفیع الدینؒ نے اختیار کیا اور دوسرا اسلوب ان کے دوسرے صاحب زادہ شاہ عبدالقادرؒ نے اختیار کیا۔

شاہ رفیع الدین نے اپنے ترجمہ میں الفاظ کو اہمیت دی، عربی لفظ کی جگہ اردو کا لفظ لا کر ترجمہ کیا، جبکہ شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ ترجمہ کیا، بامحاورہ اس معنی میں نہیں کہ لفظ کی وضاحت جملوں سے کی بلکہ ہر لفظ کی جگہ دوسرا لفظ فٹ کرنے کے بجائے جملہ یا آیت کے مفہوم کو اہمیت دی گئی۔ ان دونوں ترجموں کی فنی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا۔

''یوں تو دونوں ترجمے لفظی ہیں لیکن شاہ رفیع الدین نے ترجمہ میں عربی جملے کی ترکیب اور ساخت کی بہت زیادہ پابندی کی ہے، ایک حرف ادھر سے ادھر ہونے نہیں پایا، ہر عربی لفظ بلکہ ہر حرف کا ترجمہ خواہ اردو زبان کے محاورے کھپیں نا کھپیں انہیں کرنا ضروری ہے، شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں اس قدر لفظی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور اصل لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روزمرے اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں، دوسری خوبی ان کے ترجمہ میں ایجاز کی ہے یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں پورا مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے''۲۹

مذکورہ دونوں اسالیب ترجمہ میں بھی لفظی ترجمہ کا اسلوب کم ہی مترجمین نے اختیار کیا۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں'' ہر چند ترجمہ تحت لفظی میں بعض خاص فائدے ہیں مگر ترجمہ سے اصلی فائدہ اور بڑی غرض یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو قرآن شریف کا سمجھنا آسان ہو جائے، یہ غرض قدرے بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ جو

بامحاورہ ترجمہ کے بانی اورامام ہیں انہوں نے بامحاورہ ترجمے کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے جو اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانہ میں جس نے اس میدان میں قدم رکھا اس نے جناب شاہ صاحب ممدوح کا اتباع کیا اور بامحاورہ ترجمہ کرنے کو اختیار کیا'' ۳۰

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان دونوں اسالیب ترجمہ سے ہٹ کر تیسری راہ اختیار کی، اور ایسا ترجمہ کیا جسے انہوں نے ''کتابی زبان'' کا نام دیا ہے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ترجمہ اسی اسلوب کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تیسرے طریقہ ترجمہ کے ضمن میں کیا ہے، گو تمام تر نہ سہی جزوی طور پر ہی سہی۔

مولانا تھانوی اپنے ترجمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اول قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے جس میں قابل فہم ہونے کے ساتھ تحت لفظی کی بھی رعایت ہے، دوم، ترجمہ میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے گئے ہیں، دو وجہ سے اول تو میں قصباتی ہوں محاورات پر عبور نہیں دوسرے یہ کہ محاورات ہر شہر کے جدا جدا ہوتے ہیں، اگر دہلی کے محاورات لیے جائیں تو اہلِ لکھنؤ نہ سمجھتے، یہاں کے محاورات وہاں نہ سمجھتے، ان دونوں کے محاورات حیدرآباد اور مدراس والے نہ سمجھتے، غرض ایسے محاورات عام فہم نہیں ہوتے، اور اردو ترجمہ کم از کم ایسا تو ہو کہ قریب قریب ہندوستان کے سب حصے تو اس کو سمجھ جاویں۔ اس لیے کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ اس میں سلاست بھی ہے'' ۳۱

مولانا تھانوی کے اسلوب ترجمہ کا اتباع ان کے مُرید خاص مولانا عبدالماجد دریابادی نے کیا، ہر چند کہ مولانا دریابادی خود صاحب طرز انشاء پرداز اور ادیب تھے مگر ترجمہ قرآن میں انہوں نے اپنے پیر و مرشد کے ترجمہ کی بالکلیہ تو نہیں مگر غالب حد تک پیروی کی، چنانچہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ۔

''میرا ترجمہ تو کہنا چاہئے کہ ۷۵ فی صد اسی ترجمہ اشرفیہ کی نقل ہے اور تفسیری حصہ میں بھی فقہیات میں سے بڑی حد تک اسی بیان القرآن سے لی ہیں'' ۳۲

اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بھی مولانا دریابادی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس عاجز نے اپنے لیے دلیل راہ حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کے ترجمہ کو بنایا جو اُن کی تفسیر بیان القرآن کے ساتھ ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں اول بار شائع ہوا ہے، اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بس اپنا نظیر آپ ہی ہے'' ۳۳

شاہ ولی اللہؒ کی طرح مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی ترجمہ کے چار مدراج قرار دیے ہیں (۱) ترجمہ تحت اللفظ (۲) ترجمہ نحوی (۳) ترجمہ اسلوبی (۴) ترجمہ خیالی مولانا فراہی کے نزدیک اسلوبی ترجمہ سے مراد بامحاورہ ترجمہ ہے اور خیالی ترجمہ سے مراد یہ ہے کہ اصل خیال کو ملحوظ رکھا جائے اور لفظوں کی پابندی نہ کی جائے، خیالی اور اسلوبی دونوں ترجموں کے بارے میں مولانا فراہی لکھتے ہیں۔ خیالی ترجمہ جیسا کہ ظاہر ہوا نہایت مخدوش ہے اور بامحاورہ ترجمہ جس کا نام میں نے اسلوبی ترجمہ رکھا ہے انسب ہوگا بلکہ بامحاورہ کی پابندی بھی بہت سنبھل کر کرنی ہوگی تا کہ اسلوب کلام اور مدلول اصل باقی رہے'' ۳۴

ترجمہ اور ترجمانی:

اردو تراجم قرآن کے ذخیرہ میں ایک چوتھا اسلوب ترجمہ بھی ملتا ہے مگر وہ شاہ ولی اللہؒ کے اختیار کردہ چوتھے اسلوب کی تقلید نہیں ہے۔ بلکہ اپنی نوعیت کا الگ ترجمہ ہے جسے وضاحتی اور تشریحی ترجمہ کہا جا سکتا ہے کسی حد تک اسے مولانا فراہیؒ کی زبان میں ''خیالی ترجمہ'' سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے، ان مترجمین نے اسے ترجمہ کے بجائے ترجمانی کا نام دیا ہے، جس میں لفظی اور بامحاورہ دونوں ترجموں سے آگے بڑھکر قرآن کے مدعا اور اور اسلوب کلام کو سمجھ کر اردو کے اسلوب کلام اور اپنے انداز میں ڈھالا گیا ہے۔

اس اسلوب ترجمہ کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد نے رکھی اور اپنے ترجمہ وتفسیر کا نام ہی ترجمان القرآن رکھا۔ اس اسلوب ترجمہ کو دوسرے مشہور عالم مولانا

ابوالاعلیٰ مودودی نے آگے بڑھایا، گوکہ تدبر قرآن کے مولف مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے اسلوب ترجمہ کے بارے میں وضاحت نہیں کی ہے مگر تدبر قرآن کا ترجمہ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ انہوں نے بھی قریب قریب یہی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ترجمہ قرآن کا اسلوب بایں الفاظ بیان کرتے ہیں ''کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اردو میں اس طرح مرتب ہوجائے کہ اپنی فصاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے، اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ترجمان القرآن کے نوٹ تشریح و وضاحت کا ایک مزید درجہ ہیں ورنہ قرآن کا صاف صاف مطلب سمجھ لینے کے لئے متن کا ترجمہ پوری طرح کفایت کرتا ہے، میں نے تجربہ کے لیے سورہ بقرہ کا مجرد ترجمہ ایک پندرہ برس کے لڑکے کو دیا جو اُردو کی آسان کتابیں روانی کے ساتھ پڑھ لیتا تھا، پھر ہر موقع پر سوالات کر کے جانچا، جہاں تک مطلب سمجھ لینے کا تعلق ہے وہ ایک مقام پر بھی نہ اٹکا اور تمام سوالوں کا جواب دیتا گیا'' ۳۵

مولانا مودودی نے اپنے اسلوب ترجمہ کی وضاحت کرنے کے لئے لفظی ترجمہ کی پانچ خرابیاں بیان کی ہیں۔

اول:- روانی عبارت زور بیان بلاغت زبان اور تاثر کلام کا فقدان ہے۔

دوم:- بین السطور میں ترجمہ دینے یا دو حصوں میں متن و ترجمہ کو متوازی تقسیم کرنے کی وجہ سے ترجمہ قرآن کو مسلسل نہیں پڑھ سکتے اور نہ اثر قبول کر سکتے ہیں۔

سوم:- قرآن کا طرز بیان تقریری ہے اگر اس کا ترجمہ کرتے وقت تحریر کی زبان میں نہ ڈھالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہوجاتی ہے۔

چہارم:- قرآنی آیات کا اپنے پس منظر اور شان نزول سے گہرا تعلق ہے اگر اس سے الگ کر کے صرف الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو قطعاً نہیں سمجھے گا۔

پنجم:۔ قرآن کی مخصوص اصطلاحی زبان بھی ہے پابندی لفظ کے ساتھ بھی ترجمے کیے جاتے ہیں اس میں اصطلاحی زبان کی رعایت نہیں ہوتی۔

پہلے نکتہ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

''پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمہ کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہے، قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل وفکر تسخیر کرتی ہوئی قلب وجگر تک اترتی چلی جارہی ہے، اس طرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار ترجمہ کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے رہی ادب کی وہ تیز وتند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اس کا کوئی حصہ ترجمہ میں شامل ہونے نہیں پاتا۔''[۳۶]

ترجمہ تفہیم القرآن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

''میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اُسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کردوں، اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مُبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقہ سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو اور کلام الٰہی کا مطلب ومدعا صاف صاف واضح ہونے کے

ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زور بیان بھی جہاں تک بس چلے ترجمانی میں منعکس ہو جائے'' ۳۷

ترجمہ اور ترجمانی میں کیا فرق ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۵ میں ہے۔

فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوالزکوۃ فخلّوا سبیلھم

اس آیت کا ترجمہ مترجمین نے اس طرح کیا ہے۔

اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ ۳۸

یعنی آیت کے لفظ ''سبیلھم'' کا اردو ترجمہ راستہ ہوگا، اور تقریباً سبھی حضرات کے ترجموں میں خواہ وہ لفظی ہوں یا بامحاورہ یہی ترجمہ ملے گا، مگر جن حضرات نے ترجمانی کی ہے انہوں نے لفظ ''راستہ'' کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمانی اس طرح ہے۔

''پھر اگر ایسا ہو کہ وہ باز آ جائیں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان سے کسی طرح کا تعرض نہ کیا جائے'' ۳۹

مولانا امین احسن اصلاحی کی ترجمانی یوں ہے۔

''پس اگر یہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تب ان کی جان چھوڑ دو'' ۴۰

مولانا مودودی کی ترجمانی اس طرح ہے:

''پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو'' ۴۱

زبانوں میں تغیراتی عمل:

زبانیں زمانوں کے تغیرات کا اثر قبول کرتی ہیں، محاکات، تعبیریں، اصطلاحیں، محاورے، طرز ادا، یہاں تک کہ الفاظ اور جملے بھی حالات اور ظروف کے بدلنے سے اپنے معانی و مطالب کی جہت بدلتے ہیں، اور تخصیص یا توسیع کے مرحلہ

سے گذرتے ہیں بعض الفاظ متروک ہو جاتے ہیں، بعض کے معانی متروک ہوتے ہیں۔ اسی لیے کسی ایک زمانی مرحلہ میں کیا گیا ترجمہ خواہ وہ کتنا ہی مستند، عوامی اور ٹکسالی کیوں نہ ہو دوسرے زمانے میں آؤٹ آف ڈیٹ یعنی از کار رفتہ معلوم ہونے لگتا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید اولین اردو ترجموں میں سے ہے، اس کی زبان اپنے وقت کی ٹکسالی ہے اور اس کا استناد و اعتبار بلا امتیاز مکاتب فکر اردو کے تمام علماء کے نزدیک بہت وقیع ہے، مولانا محمود الحسنؒ نے جب قرآن مجید کا ترجمہ عوام میں رائج کرنا چاہا تو انہوں نے اسی ترجمہ کا انتخاب کیا۔ اور اسے اپنے عہد کے مروجہ لسانی معیار سے مطابقت کرنے اور عوامی زبان سے قریب کرنے کے لیے تغیرات اور حک واضافہ سے کام لیا۔ دونوں ترجموں کا تقابل کیا جائے تو شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ایسی قدیم روح معلوم ہوتی ہے جسے نئے قالب میں ڈھالا گیا ہو۔ جبکہ آج وہ نیا قالب بھی قدیم تراجم میں شمار ہوتا ہے اور اسے ہم عصر لسانی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے،

چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں۔

''حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں ترمیم کی ضرورت ہے تو انہوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی جو ترجمہ شیخ الہند کے نام سے معروف و مشہور ہوا احقر نے قرآن کریم کے زیر متن اسی ترجمہ کو بعینہ لیا ہے'' ۴۲

خود مولانا محمود الحسن شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی تجدید و تسہیل کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس ننگ خلائق کو یہ خیال ہوا کہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ممدوح کے مبارک مفید ترجمہ میں لوگوں کو جو کل دو خلجان ہیں یعنی ایک بعض الفاظ و محاورات کا متروک ہو جانا، دوسرے بعض بعض مواقع میں ترجمہ کے

الفاظ کا مختصر ہونا جو اصل میں تو ترجمہ کی خوبی تھی مگر ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آ گئی کہ جس سے ایسے مفید اور قابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سو اگر غور و احتیاط کے ساتھ ان الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لیے جائیں اور اختصار و اجمال کے موقعوں کو تدبر کے ساتھ کوئی لفظ مختصر زائد کر کے کچھ کھول دیا جائے تو پھر انشاء اللہ حضرت شاہ صاحب کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے اور مسلمانان ہند بھی اس کے فوائد مخصوصہ سے خالی نہیں رہ جائیں گے''

اس کی دوسری مثال علامہ محمد مارمارڈوک پکتھال کا انگریزی ترجمہ'' دی میننگ آف دی گلوریس قرآن'' ہے، جو ان کے بقول پہلے مسلمان انگریز کا ترجمہ ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں لکھا گیا، بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک دوسرے انگریز مترجم قرآن ٹی بی ارونگ پروفیسر السنۃ شرقیہ کیلیفورنیا یونیورسٹی نے دوسری عالمی قرآن کانگریس منعقدہ ہمدرد نگر دہلی دسمبر ۱۹۸۳ء میں یہ خیال ظاہر کیا کہ پکتھال کے انگریزی ترجمہ قرآن کی زبان انگریزی معاشرے کے بعض علاقوں میں نامانوس ہو چکی ہے۔

زبان کے تغیراتی عمل کا مسئلہ صرف ترجمہ کی زبان سے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ اصل زبان سے بھی متعلق ہے، جس فن پارے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اس عہد کے اور جس عہد میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس میں اگر طویل زمانی فاصلہ حائل ہو جائے تو فن پارے کے تصنیفی عہد کے لسانی مزاج، معیار اور استعمالات میں تغیر ہو جانا بھی ناگزیر ہے، مترجم اگر اس تغیر و تبدیلی کی نوعیت سے واقف نہ ہو تو ترجمہ میں غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے، چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

''عربی زبان بالخصوص قرآن کی زبان کے معاملہ میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس وقت وہ زبان کہیں بھی رائج نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے، عرب و عجم

دونوں ہی میں اس وقت جو عربی پڑھی اور پڑھائی لکھی اور بولی جاتی ہے وہ اپنے اسلوب وانداز اپنے لب ولہجہ اور اپنے الفاظ ومحاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن ہے، ہمارے اپنے مدرسوں میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے وہ قلیوبی، نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری ومتنبی کے قسم کی عربی ہے، عرب شام اور مصر میں جو عربی رائج ومقبول ہے اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل واخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے لیکن قرآن کی زبان سے اتنی مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق نہیں پیدا کرتا بلکہ قرآن سے یہ بے گانہ کرتا ہے۔''۴۳

یہ بیان اگرچہ مبالغہ آمیز ہے مگر اس کی جزوی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مبالغہ آمیز اس وجہ سے کہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں قرآن کی زبان میں موجودہ عربی زبان سے باوجود طویل زمانی فاصلہ کے اتنا تغیر نہیں ہوا کہ نا قابل فہم ہو جائے۔

ترجمہ پر ذوق اور رجحان کے اثرات:

کوئی بھی عالم اپنے ذوق، مزاج اور رجحانات سے الگ نہیں ہوتا، ترجمہ قرآن میں اگرچہ ان کا رنگ وآہنگ شامل ہونا ترجمہ قرآن کے مقصد ومنہاج سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس سے گریز کرنا ہر مترجم کی اولین ذمہ داری ہے، مگر اس کو کیا کیجئے کہ اردو تراجم قرآن کے ذخیرہ میں بھی تفسیر کی طرح مترجم کے ادبی ولسانی ذوق، فقہی ومسلکی رجحان اور کلامی رنگ کی اثر انگیزی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن اپنے عہد میں بہت مشہور ہوا۔ اسے عوامی ترجمہ سے تعبیر کیا گیا، ڈپٹی صاحب چونکہ ناول نگار افسانہ نویس اور ادیب تھے اس لئے اپنے اس ذوق کا استعمال انہوں نے ترجمہ قرآن میں بھی کیا، اور کثرت سے عوامی محاورے، روزمرہ کی بول چال کے فقرے یہاں تک کہ وہ استعارے بھی استعمال کے جو شرفاء کے نزدیک غیر سنجیدہ اور معیار سے فروتر تھے، اس عوامی ذوق کے نتیجہ میں

بعض مقامات پر قرآنی الفاظ وعبارت کی متانت وثقاہت مجروح ہوئی اور بعض مقامات پر ترجمہ کی صحت برقرار نہ رکھ سکے، مثال کے طور پر سورہ یوسف کی آیت ''ذھبنا نستبق وترکنا یوسف عندمتاعنا'' کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

''ہم تو جا کر ایک طرح کی کبڈی کھیلنے لگے اور یوسف کو ہم نے اسباب کے پاس چھوڑ دیا'' ۴۴

کبڈی ایک ہندوستانی کھیل ہے جس کو نستبق کے ترجمہ کے بطور دیا گیا۔ جبکہ اس کا ترجمہ دوڑ میں مسابقت ہے دوڑ میں آدمی دور نکل جاتا ہے جبکہ کبڈی ایک ہی دائرہ میں ہوتی ہے، اس طرح کی غلطیاں ترجمہ کو عوامی اور محاوراتی رنگ دینے کی وجہ سے ہوئیں ہیں اسی لئے ثقہ علماء نے اس ترجمہ پر تنقید کی اور اغلاط واضح کیں، مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اصلاح ترجمہ دہلویہ کے نام سے مستقل رسالہ رقم کردیا، اس طرح کی مثالیں اور بھی مترجموں کے یہاں مل جاتی ہیں۔

ادبی ذوق کی طرح مسلکی اور کلامی رجحان بھی ترجمہ قرآن کی راہ میں لغزشوں کا باعث بنا ہے، مثال کے طور پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ترجمہ کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن معروف ہے، اس ترجمہ میں رسول پاک ﷺ کے سلسلہ میں وہ قرآنی آیات جو مترجم کے تصور اور رجحان کی تائید نہیں کرتیں ان کا ترجمہ قرآن کے مزاج اور عربی زبان وادب کے معروف ضابطہ سے ہٹ کر یا قدرے تصرف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور سورہ کہف کی آخری آیت ''قل انما انا بشر مثلکم'' کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے ''تم فرماؤ ظاہر صورت بشری میں تو میں تم جیسا ہوں'' ۴۵

رسول کریم کی بشریت کی نفی کے عقیدہ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ترجمہ کی ہیئت تبدیل کی گئی اور ظاہر صورت کا اضافہ کیا گیا، ترجمہ میں جس کا کوئی محل نہیں۔

اسی طرح سورہ فتح کی دوسری آیت ''لیغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وماتأخر'' کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ''تا کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے

اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے'' عربی زبان کے لحاظ سے یہ ترجمہ درست نہیں، جمہور مترجمین و مفسرین کے بھی برخلاف ہے جو ترجمہ اس طرح کرتے ہیں'' تا کہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے''

تقابلی ترجمہ:

اردو زبان میں بعض تراجم قرآن تقابلی انداز کے کئے گئے ہیں، یعنی ایک ترجمہ کرنے کے ساتھ دوسرے معروف تراجم کو بھی پیش کر دیا گیا ہے تا کہ قاری کے سامنے قرآنی الفاظ کے ترجمہ، تعبیر اور تشریح کی ممکنہ جہات آجائیں، یہ اگرچہ ترجمہ کا کوئی اسلوب نہیں ہے مگر قرآن کے مفہوم کے تنوع کو ظاہر کرنے کے لئے یہ طریق کار بہت کارآمد ہے۔ اس سلسلہ میں سید قطب شہیدؒ کی عربی تفسیر فی ظلال القرآن کا اردو ترجمہ مولانا سید حامد علی مرحوم نے کیا ہے، اس میں قرآنی آیات کا بھی ترجمہ کیا ہے اور اسی کے ساتھ معروف اردو تراجم کا نمونہ بھی حاشیہ میں پیش کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ العبس کی آیت فاذا جاء ۃ الساخۃ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے''تو جب صور قیامت برپا ہوگا'' اور حاشیہ میں حسب ذیل تراجم کو نقل کیا ہے۔

(۱) آوے وہ غل (شاہ عبدالقادر) (۲) آئے وہ کان پھوڑنے والی (شیخ الہند) (۳) جب صور قیامت برپا ہوگا جس کے سننے سے کان بہرے ہو جائیں گے (ڈپٹی نذیر احمد) (۴) آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی (ابوالاعلیٰ مودودی) (۵) کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز آئے گی (امین احسن اصلاحی) ۴۶

حواشی و مراجع

۱ ابن منظور لسان العرب مادہ رجم

۲ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری مصر ۱/۳۴

۳ بخاری کتاب الاحکام

۴ شمس الائمہ السرخسی، المبسوط، مصر ۱۳۲۴ھ ۱/۳۷

۵ ملاحظہ شاہ ولی اللہ کے قرآنی فکر کا مطالعہ نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص ۱۲

۶۔ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، تفسیر سورہ ابراہیم آیت نمبر ۴

۷۔ ڈاکٹر حمید شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر حیدرآباد ص ۱۰۹

۸۔ جنوبی ہند میں عم یتساءلون کے اردو گجراتی ترجمہ کو بعض لوگ اولین ترجمہ مانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق قدیم اردو دہلی ص ۲۲ قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر ص ۴۴

۹۔ المقدمہ فی قوانین الترجمہ، قلمی کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰۔ نقش دوام، دیوبند ص ۳۵۸

۱۱۔ تفسیر ماجدی اول لکھنؤ ۱۹۹۵ء افتتاحیہ ص ۹

۱۲۔ عبدالباری ندوی، مبادی علم الانسان، دیباچہ ص ۲، نیز دیکھئے تحسین فراقی، عبدالماجد دریابادی احوال وآثار، لاہور ۱۹۹۳ء ۲۴۳

۱۳۔ جمیل جالبی، تنقید اور تجربہ، کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۵

۱۴۔ عبدالماجد دریابادی احوال وآثار، ص ۲۴۲

۱۵۔ قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر، ص ۳۳

۱۶۔ تفسیر ماجدی اول، افتتاحیہ، ص ۹

۱۷۔ فی ظلال القرآن اول اردو ترجمہ، دہلی ۱۹۸۵ء ص ۴۷

۱۸۔ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مطبوعہ شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلکس سعودی عربیہ

۱۹۔ تفہیم القرآن، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، جلد سوم، ۱۹۹۹ء ص ۱۱۹

۲۰۔ تدبر قرآن مطبوعہ تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء جلد پنجم ص ۲۹

۲۱۔ ترجمان القرآن، مطبوعہ ساہتہ اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء جلد چہارم، ص ۶۳۴

۲۲۔ عبدالماجد دریابادی، خطوط مشاہیر، ۱/۴۵

۲۳۔ اکمل الدین احسان اوغلو ترجمہ جمشید احمد ندوی، تراجم قرآن کے مخطوطات، علوم القرآن، علی گڑھ، جنوری تا جون ۲۰۰۲ء

۲۴۔ ترجمہ قرآن از مولانا محمد جونا گڑھی، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلکس۔

۲۵۔ المقدمہ فی قوانین الترجمہ

۲۶۔ ستارہ یا بادبان علی گڑھ ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۵

۲۷۔ اصول اصطلاح سازی، مشتملہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۵ء،

ص ۱۴۹
۲۸ المقدمہ فی قوانین الترجمہ
۲۹ قدیم اردو، ص ۳۲
۳۰ ترجمہ شیخ الہند، مطبوعہ دہلی، مقدمہ
۳۱ بیان القرآن اول، خطبہ، تاج پبلیشر دہلی
۳۲ عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، ص ۲۹۶
۳۳ تفسیر ماجدی اور لکھنؤ ۱۹۹۵ء
۳۴ قرآنی مقالات، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱
۳۵ ترجمان القرآن اول، دہلی ۱۹۶۴ء ص ۴۹۔۴۸
۳۶ تفہیم القرآن اول، دہلی دیباچہ
۳۷ حوالہ مذکور
۳۸ ترجمہ شیخ الہند، تفسیر سورہ التوبہ
۳۹ ترجمان القرآن، تفسیر سورہ التوبہ
۴۰ تدبر قرآن، تفسیر سورہ التوبہ
۴۱ تفہیم القرآن تفسیر سورۃ التوبہ
۴۲ معارف القرآن مکتبہ مصطفائیہ دیوبند جلد اول ص ۶۹ تمہید
۴۳ تدبر قرآن جلد اول مقدمہ ص ۱۱۵
۴۴ ڈپٹی نذیر احمد، ترجمہ قرآن، دہلی، سورۂ یوسف
۴۵ احمد رضا خان بریلوی، کنز الایمان فی ترجمہ القرآن، فرید بکڈپو دہلی
۴۶ سید حامد علی، اردو ترجمہ فی ظلال القرآن، پارہ عم، دہلی، مقدمہ

☆☆☆